مذہبی و قومی ہم آہنگی میں سرسید کا کردار

محمد محدث

ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

تلخیص: سرسید احمد خاں کا شمار انیسویں صدی کے ان نفوس میں ہوتا ہے، جنہوں نے مذہبی ہم آہنگی کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے مذہبی رواداری کے فروغ کے لیے طرح طرح کی عملی کوششیں کی ہیں۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے نام کوشش کے بعد ملک میں فرقہ ورانہ ماحول کو ہوا دیا گیا۔ بغاوت کا اصل ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھرایا گیا اور عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی گئی ایسی نازک صورتِ حال میں سرسید احمد خاں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے اس نفرت کا سدِ باب کیا۔ انہوں نے عملی خدمات کے ذریعہ بھی مذہبی یکجہتی کا نمونہ پیش کیا۔ زیرِ نظر مضمون میں سرسید کی انہیں کوششوں کا بقدرِ تفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ : قوم مذہب سرسید علی گڑھ ہم آہنگی یکجہتی رواداری تعلیم تعمیر ترقی ہندوستان وطن ملک اتحاد اتفاق۔

سرسید احمد کا شمار انیسویں صدی کے ان مفکرین میں ہوتا ہے جن کی بے لوث خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید ایک عظیم دانشور، روشن خیال اور دور اندیش ماہرِ تعلیم، شاندار ادیب، علمی و سماجی مصلح، ہمہ گیر و بلند خیال مصنف، ماہر قانون، بیدار مغز سیاست داں، سیرت نگار، مفسرِ قرآن، جدید علم الکلام کے بانی، قومی رہنما، بے باک صحافی، سیکولرزم و ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی، جدید ہندوستان کے عظیم معمار اور مذہبی و قومی ہم آہنگی کے علمبردار تھے۔ آج سرسید امن و آشتی کے پیمبر کی حیثیت سے کائناتِ علم و ادب میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بے شمار روشن پہلو ہیں اور ہر پہلو پر متعدد پر مغز مقالے سپردِ قرطاس کیے جا سکتے ہیں۔

سرسید احمد خان ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ علمی ہونے کے باوجود پرانی قدروں کا دلدادہ تھا۔ سرسید نے اپنی زندگی میں تعلیم کے فروغ کے لیے بہت محنت کی۔ مجتہدانہ بصیرت، روشن خیالی اور فکر و آگہی سے ملک و قوم کی ایسی آبیاری کی کہ رہتی دنیا تک تشنگانِ علم و فن سیراب ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی میں برطانوی حکمرانوں نے باہمی اختلافات، خانہ جنگی اور تقسیم کو بڑھاوا دیا۔ اس مشکل وقت میں سرسید احمد خاں اصلاح و اتحاد کے روشن مینار بن کر ابھرے۔

سرسید کی زندگی اور ان کی تعلیمات کا نصب العین یہ تھا کہ اہلِ وطن باہمی تعلقات کو استوار کریں، ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنے تن من دھن سے تعاون پیش کریں اور مذہبی بنیادوں پر کسی قسم کی کوئی تفریق کو فروغ نہ دیں۔ سرسید بلا تفریق مذہب و ملت انسانی فلاح کے سچے حامی تھے۔ سرسید

مذہبی ہم آہنگی کے ذریعے ملک کی تعلیمی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے متمنی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں جب غازی پور میں سرسید نے ایک کالج قائم کرنے کی دلی خواہش کا اظہار عوام کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس دوران انہوں نے ہندوستانی عوام کو ایک قوم کہہ کر خطاب کیا تھا ''اے ہندوستانی صاحبو'' جملے کا بار بار استعمال کرنا ان کی نیک نیتی اور خلوص کو ثابت کرتا ہے۔ پھر سرسید نے سماج کے مختلف باشندگان کے درمیان اظہارِ یکجہتی کے فروغ کے لیے غازی پور میں ایک ادارہ قائم کیا تھا جو بعد میں وکٹوریہ اسکول کے نام سے معروف ہوا۔ سرسید نے عوامی مشورے سے اس ادارے کا پیٹرن اور وزیٹر راجہ دیو نرائن سنگھ بہادر کو نامزد کیا۔ سرسید نے اس موقع پر عوام سے پر مغز خطاب کیا، اس کے چند جملے ملاحظہ کریں :

''اے صاحبان! تم خوب جانتے ہو کہ انسان کو لازم ہے کہ تمام جہان کے انسان کی بھلائی چاہے۔ اگر ہم ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھیں تو جان لیں گے کہ ہم سب آپس میں بھائی اور ایک باپ کی اولاد ہیں، گو آفتاب کی تیزی نے کسی ملک میں ہم میں سے کسی کا رنگ کالا اور کسی ملک میں دھوپ کی نرمی نے کسی کا رنگ گورا کر دیا ہو۔ مگر ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ پس ہم سب کو بلا تعصب تمام انسان کی بھلائی چاہنی چاہیے۔.... یہ مدرسہ بلا کسی تعصب کے تمام لوگوں اور ہر ایک قوم کے فائدہ کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اس سے اس مدرسہ میں کسی قوم کی مذہبی کتابیں پڑھنے کا بھی امتناع نہ ہوگا۔ ہر ایک مذہب کی کتابیں اس مدرسہ میں جو شخص ان کا پڑھنا چاہے پڑھائی جائیں گی۔'' ۱

سرسید احمد خاں مراد آباد میں ۱۸۶۰ء میں صدر الصدور تھے اس دوران اس خطے میں ایک قدرتی وبا پھیل گئی تھی جس سے عوام میں بے چینی اور خوف کا ماحول تھا۔ اس وقت کے حاکم اعلیٰ نے قحط کی انتظام و انصرام کی ذمے داری سرسید کے سپرد کی تھی۔ اس دوران سرسید نے انسانی، قومی اور مذہبی خدمات کے ذریعہ ملک گیر اتحاد و بھائی چارے کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے ایک مثال قائم کی تھی۔ اس حوالے سے حالی ''حیاتِ جاوید'' میں رقم طراز ہیں :

''اس موقع پر قطعِ نظر لیاقت اور سلیقۂ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرسید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستان کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔..... محتاج خانے میں حسنِ انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا بیماروں کے لیے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھے۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے۔... سرسید صبح و شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانے خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوتے تھے ان کو سرسید خود اپنی گود میں اُٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے لٹا دیتے تھے ان کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔'' ۲

سرسید احمد خاں پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے مذہبی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو دلہن کی آنکھ سے تعبیر کیا۔ تمام ہندوستانیوں کو پستی اور حالتِ زار سے نکالنے کے لیے مسیحائی کا فریضہ انجام دیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حکومتِ برطانیہ نے پورے ملک کو انتقامی آگ کے حوالے کر دیا تھا۔ جس سے پورے ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ہزاروں بے گناہ اور معصوم ظلم و بربریت کا شکار ہو رہے تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی تو تھی ہی کہ پھوٹ ڈالو راج کرو، اس لیے وہ قوموں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیا کرتے تھے جس سے نفرت کو فروغ

ملتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انگریزوں نے اس بغاوت کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھیرایا کیوں کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی گئی تھی۔ اس کس مپرسی کے دوران قوموں، ذاتوں اور برادریوں کے درمیان باہمی تعلقات کی ضرورت تیزی سے محسوس ہونے لگی۔ اس وقت سر سید نے اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے ملک پر ہو رہے ظلم و بربریت کا ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر سدِ باب کیا۔ سر سید نے دانش مندی اور مضبوط طرزِ استدلال کے ساتھ برطانوی قوتوں کو اصل حقائق سے واقف کراتے ہوئے یہ باور کرایا کہ بغاوت کے ذمہ دار ہندو یا مسلم نہیں بلکہ خود انگریز حکومت کی قانون ساز کونسل اور ناکارہ انتظامیہ کی حکمتِ عملی ہے۔

سر سید احمد خان نہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے حوالے سے معروف ہیں بلکہ ان کی حکمتِ علمی بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے بھی بے مثال ہے۔ وہ اپنے مضامین اور خطبات کے ذریعے بھی مذہبی رواداری پر زور دیا کرتے تھے ان کا ماننا تھا کہ ہر مذہب انسانیت کا درس دیتا ہے اور مذہبی اختلافات کو ہوا دینا، نفرت پیدا کرنا، معاشرتی ترقی کے لیے بڑی رکاوٹ ہے۔ سر سید نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے اور اسے سیاست یا معاشرتی معاملات میں الجھانے سے گریز کیا جانا چاہیئے۔ سر سید نے قرآن کی جدید تفسیر کی تھی جس میں انہوں نے دوسرے مذاہب کے عقائد کے بارے میں مثبت رویہ اپنایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تمام مذاہب کی بنیادی تعلیمات انسانیت کی قدر کرنا ہے۔ تمام مذاہب ایک ہی منزل کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ سر سید نے اپنے دور میں مذہبی مکالمے کی حوصلہ افزائی کی تھی تاکہ مختلف مذاہب کے درمیان غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔ انہوں نے صحافت کے ذریعے بھی مختلف مذہبی کمیونیٹیز کے درمیان محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیا تھا۔ ان کا مقصد برطانوی دورِ حکومت میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان ایک سازگار ماحول پیدا کرنا تھا۔ اس حوالے سے سر سید احمد خاں نے ایک مضمون 'غیر مذہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہئے' تحریر کیا تھا، اس مضمون سے ان کی مذہبی پیشواؤں سے ہم آہنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سر سید نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی ارتباط پر اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ خوب زور دیا ہے۔ باہمی اتحاد و اتفاق پر خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح آریا ہندو کہلاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلا سکتے ہیں۔ مذہبی ہم آہنگی اور ہندو مسلم کے درمیان اظہارِ یکجہتی کے فروغ کے لیے اپنے مضمون 'ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط' میں اپنے خیالات کا اظہار اس انداز سے کرتے ہیں:

''ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔ ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھاتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔... ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے، ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے۔ کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جاوے گی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی۔ تو کانی ہو جاوے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے'' ۳

سر سید ہندو مسلم دوستی کے سچے دل سے خواہش مند تھے اور انہیں بردرانِ وطن کے جذبات کا بے حد خیال تھا۔ گائے کی قربانی کو لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اکثر بحث و تکرار ہوتی تھی اس سے متعلق سر سید کے خیالات ملاحظہ کریں۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

''اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔'' ۴

سرسید نے گؤکشی کے خلاف ملک گیر تحریک بھی چلائی تھی اور ہمیشہ کے لیے کالج کے ہاسٹل میں گائے کے گوشت پر پوری طرح پابندی عائد کر دی تھی اور آج بھی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ان کے اس عمل کو بردرانِ وطن قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مختلف قوموں کے درمیان باہمی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے سلسلے میں علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یکجہتی اور برادریوں میں ہم آہنگی کو عام کرنے کی کوششوں میں سب سے اہم اور سب سے بڑی کاوش علی گڑھ تحریک تھی۔ سرسید نے اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی تھی جو بعد میں ترقی پاکر محمڈن انیگلو اورینٹل کالج میں تبدیل ہوا اور ۱۹۲۰ء میں یونیورسیٹی کا درجہ حاصل ہوا۔ جہاں اس کا مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا تھا وہیں اس ادارے کا مقصدِ اصلیہ تعلیم کے ذریعہ ہندو مسلم میں اتحاد و اتفاق اور مختلف قوموں کے درمیان یکجہتی کی روایت کو مستحکم کرنا تھا۔ سرسید ایک وسیع النظر اور دور اندیش انسان تھے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ تعلیم ہی مذہبی تعصبات کو ختم کر سکتی ہے اور مختلف قوموں کو قریب بھی لا سکتی ہے۔اس لیے وہ اپنے مشن کو کسی ایک کمیونٹی تک محدود نہیں رکھ سکتے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی طلباء کی موجودگی نے مختلف برادریوں کے درمیان ہمیشہ سے ہی ایک خوشگوار تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سرسید جب لاہور کے دورے پر تھے تو انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے صدر دیال سنگھ نے سپاس نامہ پیش کیا تھا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے متعلق غیر مسلم کتنی اچھی اور مثبت رائے رکھتے تھے۔ان کے غیر متعصب اور ہمہ جہت شخصیت ہونے کا تہ دل سے اعتراف کرتے تھے۔بقول دیال سنگھ :

''آپ کا برتاؤ ابتداء سے انتہا تک تعصب یا خود رائی کے دھبّے سے بالکل مبّرا رہا ہے۔ جو عمدہ تعلیمی انسٹیٹیوشن آپ نے علی گڑھ میں قائم کیا ہے اس کے فائدوں سے ہندو اور مسلمان دونوں برابر مستفیض ہو سکتے ہیں'' ۵

جو لوگ مادرِ درسگاہ کو صرف مسلمانوں کا ادارہ تسلیم کرتے ہیں سرسید نے ان کے لیے افسوس کا اظہار کیا تھا۔انہوں نے لاہور میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قایم کرنے کا ہوا یہ تھا جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں آپ بھی واقف ہیں کہ مسلمان روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ان کے مذہبی تعصبات نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔اس کی مثال اس طرح پر دی جاسکتی ہے: فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل

طاقت ور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اس کی تندرستی زوال پر ہے۔اس تمام بھائیوں کا یہ فرض ہوگا کہ اس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں۔.... مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک سی تعلیم پاتے ہیں'' ۶

ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ ہے جہاں تمام مذہب و ملت کے طلباء کے لیے یکساں اصول و قوانین ہیں۔اس کالج کا پہلا گریجویٹ اِشوَری پرساد تھا۔کالج کے بنیاد گزاروں میں جہاں مسلم اساتذہ کا انتخاب ہوا وہیں بہت سے دیگر مذاہب کے اساتذہ نے بھی اس ادارے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔پہلی بار چار طلبہ امتحان کے لیے نامزد ہوئے اس میں اِشوَری پرساد نے کامیابی حاصل کی اور اس طرح سے پہلے باقاعدہ سند یافتہ علیگ ہونے کا تاج اشوری پرساد جی کے سر ہے۔Discovering AMU کے جلد اول میں عاطف حنیف نے رقم کیا ہے:

'' 1st Jan,1881 Four students appeared in the BA examination.Ishwari prasad was the first student to pass the examination '' ۷

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا پہلا پوسٹ گریجوٹ ۱۳۹۱ء میں محترمہ سروجنی دیوی کی شکل میں دیا تھا۔اس طرح سے سرسید نے جو پودھا لگایا تھا اس نے پہلے ہی دن سے مختلف انواع واقسام کے پھل دینا شروع کر دیا تھا۔اب وہ ایک تناور درخت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تشنگانِ علم و فن کو سیراب کر رہا ہے۔سرسید نے پورے ہندوستان کی فلاح و ترقی کے خاطر اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔کالج کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مذہبی تعصبات و سماجی اختلافات سے بالاتر ہو کر تمام برادری برابر تعلیم حاصل کریں اور ترقی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں۔

سرسید تاحیات ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے اور مذہبی رواداری کی اعلیٰ قدروں کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔جب ان کے پوتے سر راس مسعود کی پیدائش ہوئی تو سرسید نے خوشی کے اظہار میں ایم۔اے۔او کالج کو سو روپیہ پیش کیا۔سر راس مسعود کی چار سال کی عمر میں بسم اللہ خوانی ہوئی تھی۔بسم اللہ خوانی کی تقریب کے وقت سرسید نے مذہبی و قومی یکجہتی کی عمدہ مثال پیش کی اور تقریب میں مختلف کمیونٹیز کے افراد کو مدعو کیا۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سر راس مسعود، رام بگھت کی گود میں تھے اور رحمن کے بندے مولوی ضیاء الحسن نے اسے بسم اللہ کی رسم ادا کرائی۔

سرسید کی سوچ تھی کہ ہر حال میں ملک کی سالمیت برقرار رہے۔ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے مادرِ وطن کی ترقی کی خاطر آپس میں اتحاد واتفاق سے رہیں۔سرسید ملک کی مضبوطی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہر ممکن کوشش کرنے کی دعوت دیتے تھے۔سرسید نے انجمن پنجاب کے جلسہ میں جو خطاب کیا تھا اس سے ان کی خیالات کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔مولانا حالی لکھتے ہیں:

''میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلالحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں۔....اے ہندو مسلمانو! کیا ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔'' ۸

سر سید کی طبیعت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ملک وملت کے لیے جو بات مفید سمجھتے تھے اس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔اس سلسلے میں ان کی ہومیپیتھک طریقۂ علاج کو فروغ دینے کی کوشش کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس کے لیے انہوں نے 'ہومیپیتھک ڈسپنری اینڈ ہوسپٹل' کھولا۔جس سے بے شمار مریض شفایاب ہوئے اور انہیں دعائیں دیں۔سر سید صرف سیاسی شعور یا کسی ذاتی مفاد کے لیے قوموں سے یکجہتی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ باہمی رواداری اور اخوت کی یہ صفتِ حمیدہ ان کے اندر فطری طور پر موجود تھی۔

سر سید احمد خان کی زندگی کے روشن پہلو اور ان کی تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ مذہبی ہم آہنگی اور یکجہتی کسی بھی معاشرے کی ترقی کے لیے لازمی ہیں۔آج جب کہ فرقہ پرست طاقتیں ملک کی سالمیت کو داغ دار کرنے کی درپے ہے تو ایسے ماحول میں ان کی تعلیمات کی اہمیت دوگنی ہو جاتی ہے۔آج جب پوری دنیا میں افراتفری اور نفرت کا بازار گرم ہے اور عالمی طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے بضد ہیں۔جبکہ عصرِ حاضر میں دنیا مذہبی، نسلی اور سماجی تناؤ کا شکار ہے ایسے ماحول میں سر سید کا بقائے باہمی کا پیغام پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔سر سید کی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے وزیرِ اعظم جناب نریندر مودی نے ۲۰۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ، آن لائن پروگرام میں اے.ایم.یو. کو چھوٹا ہندوستان کہا تھا۔ سر سید کا نظریہ آج بھی مختلف کمیونیٹیز کے درمیان رواداری اور یکجہتی کے فروغ کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حواشی:

۱ منشی محمد سراج الدین: لکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری، ص:۳۱۔۴۱، بفرمائش فضل الدین۔تاجر کتب قومی۔لاہور۔۱۹۹۰

۲ مولانا حالی: حیاتِ جاوید، ص۵۳۱۔۶۳۱، اشرف پریس لاہور، ۱۹۶۶

۳ امام الدین گجراتی و مولوی احمد بابا، آخری مضامین، ص۷۰، کوپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور

۴ مولانا حالی، حیاتِ جاوید، ص۶۸۷، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۴

۵ محمد اسماعیل پانی پتی، سید احمد کا سفر نامۂ پنجاب، ص۸۲۲، قوسین تھارٹین، لاہور، ۱۹۷۳

۶ محمد اسماعیل پانی پتی، سید احمد کا سفر نامۂ پنجاب، ۲۳۲۔۳۳۲، قوسین تھارٹین، لاہور، ۱۹۷۳

۷ Atif Hanif,Discovering AMU,volume:1,page No 127

۸ مولانا حالی، حیاتِ جاوید، ص۶۸۷۔۷۸۶، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۴